© rasailojaraid.com

قاضی جاوید

ڈاکٹر محمد افضل: چند یادیں

گزشتہ چند ماہ میں ہمارے کئی پرانے دوست دنیا سے کوچ کر گئے۔ مرحوم غلام احمد قادری ۱۹؍جنوری ۲۰۰۵ء کو اور مشفق خواجہ ۲۱؍فروری کو اور ڈاکٹر محمد افضل ۵؍مارچ کو زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ ۴۹-۱۹۵۰ء میں غلام احمد قادری اور خاکسار دونوں جامعہ عباسیہ کالج بہاولپور میں پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد افضل سے دوستی کا رشتہ ۱۹۷۲ء میں قائم ہوا، جب ہم دونوں لاہور میں ملازمت سے الگ کیے گئے تو یہ رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ قصور یہ تھا کہ آزادیٔ رائے کے اظہار پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

مشفق خواجہ سے ۱۹۹۷ء میں رشتۂ مودّت قائم ہوا۔ خاکسار ۱۹۹۷ء میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قاہرہ عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی رکا اور اپنے ایک عزیز دوست ڈاکٹر حسین محمد جعفری کے گھر پر مشفق خواجہ سے ملنا ہوا۔ انہیں ایسا ہی پایا جیسا کہ سنا تھا۔ ڈاکٹر محمد افضل پر لکھنے کے لیے ہم نے جناب قاضی جاوید اور ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ لبنیٰ ناصر سے کہا۔ قاضی صاحب نے تفصیل سے ڈاکٹر محمد افضل پر لکھا اور خوب لکھا اور بعض مقامات پر محترمہ لبنیٰ ناصر کی معلومات سے فائدہ اُٹھایا۔

البتہ محترم غلام احمد قادری اور محترم مشفق خواجہ کی وفات پر اختصار سے اپنے تاثرات رقم کیے بغیر نہ رہ سکا۔ [رشید احمد (جالندھری)]

ڈاکٹر محمد افضل کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر ذہن میں پہلا تاثر یہ ابھرتا تھا کہ "ہاں، وہ واقعی پروفیسر ہیں۔ لب و لہجہ، گفتگو، لباس، شکل و صورت، نشست، برخاست اور آداب کے ہر زاویے سے وہ ایک مکمل پروفیسر [illegible] تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ ۵؍مارچ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۰۰۵ء میں لگ بھگ پچاسی سال کی عمر میں وفات پانے والے ڈاکٹر محمد افضل اگرچہ ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے تھے، مگر تدریس سے زیادہ اُن کا تعلق ''تعلیم کے انتظامی اُمور سے'' رہا تھا۔

یہ تعلق قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا جب اُنہوں نے ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ میں ایم۔اے کرنے کے دو سال بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ امتحانات میں کلرک کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد ازاں اُنہوں نے اپنی محنت، ذہانت اور لگن کے بل بوتے پر یونیورسٹی کے کئی شعبوں میں نمایاں عہدے حاصل کیے، بعض نئے شعبے قائم کیے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین اور صدرِ مملکت کے مشیر برائے اعلیٰ تعلیم کی حیثیت سے کئی سال تک اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد اُن کو وفاقی کابینہ میں وزیرِ تعلیم کا عہدہ دیا گیا۔

تعلیمی انتظامیہ میں معمولی حیثیت سے شامل ہو کر اُس کی آخری سیڑھی تک پھلانگنے میں ڈاکٹر صاحب نے جو کامیابی حاصل کی، اُس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زندگی بسر کرنے کے عمل میں خوش بختی غیر معمولی طور پر اُن کا ساتھ دے رہی تھی اور دوسرے یہ بھی جان سکتے ہیں کہ اُن میں معاملات کو سمجھنے اور اُن کو بروئے کار لانے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔ لیکن سیڑھیوں کو پھلانگنے کے اس عمل کے پس پردہ جو انتھک محنت، مشقت اور بھرپور لگن کارفرما تھی، اُس سے باخبر صرف وہی لوگ ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کثیر الاحباب ہرگز نہ تھے اور مجلس آرائیوں سے دامن بچایا کرتے تھے۔ نمود و نمائش اور اشتہار بازی سے بھی اُن کو کوئی نسبت نہ تھی۔ میں نے شروع میں عرض کیا کہ وہ پروفیسر شپ کی تجسیم تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ اس قسم کے لوگ دوسروں سے عموماً دُور رہتے ہیں۔ یہ رویہ مردم بے زاری سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اپنے کام میں مگن رہنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آئین سٹائن کو یاد کیجیے۔ اپنے فلسفۂ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے اُس نے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مضمون میں لکھا تھا: ’’مجھے انسانوں سے بے پناہ محبت ہے اور میں اُن کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جو میرے بس میں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ میرے نزدیک نہ آئیں، دُور ہی رہیں۔‘‘ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارے ڈاکٹر محمد افضل کا تھا۔ لیکن جو لوگ مختلف حوالوں سے اُن کے قریب ہوتے تھے، ڈاکٹر صاحب اُن سے ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

خاکسار یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے قریبی حلقہ میں شامل تھا۔ البتہ زندگی میں بعض ایسے مواقع آئے جب مجھ کو اُن کے نزدیک ہونے کا موقع ملتا رہا۔ یہ تعلق میرے والد مرحوم قاضی افضل حسین کے سبب بنا جو پنجاب یونیورسٹی میں کچھ عرصہ اُن کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں میری اوّلین یادوں کا تعین بچپن کے زمانے سے ہے۔ میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب ایک روز والدِ محترم مجھ کو اپنے ساتھ دفتر لے گئے تھے۔ وہاں مجھ کو ڈاکٹر صاحب کے روبرو بھی پیش کیا گیا۔ اب حافظے کے ریکارڈ میں یہ ہیولا سا رہ گیا ہے کہ ڈاکٹر محمد افضل فائلوں سے لدے پھندے کمرے میں ایک بڑی سی میز کے سامنے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا، کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور دو چار سوال پوچھے۔ میرے جواب پر اُنہوں نے شاباش دی اور انعام میں ایک پنسل بھی دی جو آج کل نہیں ملتی۔

دوسری ملاقات طویل عرصہ کے بعد ہوئی۔ یعنی اُس زمانے میں جب میں بی۔اے کے امتحان سے فارغ ہوا اور ملازمت کی تلاش میں تھا۔ والدِ مرحوم ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ اُن دنوں ڈاکٹر صاحب پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پبلک ایڈمنسٹریشن سائنس کے چیئرمین تھے۔ یہ ایک نئے علم کا شعبہ تھا جس کو امریکن یونیورسٹی نے فروغ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۶۲ء میں اِس علم میں امریکہ کی کارنیل (Cornell) یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے تھے اور اُنہوں نے ہی یہ شعبہ یہاں قائم کیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے نیوکیمپس پر واقع اس شعبہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر وہ مجھ کو اپنی موٹر میں بٹھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر رجسٹرار کے دفتر لائے، شمشاد حیدر رجسٹرار ہوا کرتے تھے اور زبردست قسم کی شخصیت تھے۔

۱۹۶۲ء کے عشرے کے آخری دن تھے، ڈاکٹر محمد افضل پبلک ایڈمنسٹریشن کے شعبہ کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے سربراہ اور یونیورسٹی کے منصوبہ بندی کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ یہ ادارہ بھی امریکی امداد سے قائم ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ قبل ازیں اُنہوں نے ایک اور بڑا کام یہ کیا تھا کہ میٹرک اور ایف۔اے کے امتحانات کو یونیورسٹی سے الگ کر کے اُن کے لیے الگ سے امتحانی بورڈ بنانے کی تجویز دی اور جب اس تجویز کو متعلقہ حکام کی تائید حاصل ہوگئی تو بورڈ بنانے کی ذمہ داری بھی اُن کے سپرد کر دی گئی۔ آج ملک میں ثانوی تعلیم کے کئی بورڈ کام کر رہے ہیں۔ لیکن جب پہلی بار میٹرک اور ایف۔اے کے امتحانات کو یونیورسٹی سے الگ کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی، تو بہت سے لوگوں کو انوکھی اور پرخطر معلوم ہوئی تھی۔

نئی راہیں تلاش کرنے کی لگن ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ رہی اور وہ اس معاملے میں جرأت مند فیصلے کرتے تھے۔ آج ملک کے ہر شہر اور قصبے میں جگہ جگہ فوٹو کاپی مشینیں موجود ہیں اور ہر شخص کو اُن تک رسائی حاصل ہے۔ لیکن صرف تیس سال پہلے کا حکمران ان مشینوں سے بھوتوں کی طرح ڈرتے تھے۔ ان کو خوف لاحق تھا کہ لوگوں کو فوٹو کاپی کی سہولت میسر آ گئی تو ملک میں ''باغیانہ خیالات'' پھیلنے کا موثر ذریعہ مل جائے گا۔ فوٹو کاپی مشین کو وہ پرنٹنگ پریس کی طرح قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا خیال مختلف تھا۔ وہ ان مشینوں کو جدید زندگی کی ایک اور ضروری سہولت سمجھتے تھے۔ وہ حکمرانوں کے سامنے اپنے خیالات مؤثر انداز میں پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اقتدار والوں کو اپنی رائے بدلنا پڑی۔ اور کسی لائسنس کے بغیر فوٹو کاپی مشین استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔

کچھ ایسا ہی معاملہ وڈیو گیمز کے ساتھ پیش آیا جن کے بارے میں اہلِ اقتدار یہ کہتے تھے کہ وہ ہماری ثقافت برباد کر دیں گی۔ اُن کی عام اجازت دِلوانے میں بھی ڈاکٹر محمد افضل نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لاہور کے الحمرا ہال جنرل ضیاء الحق کی آمد سے پہلے تعمیر ہو چکے تھے۔ آج وہ نہ صرف اس شہر بلکہ ملک میں ثقافتی سرگرمیوں کے اہم مرکز ہیں۔ ضیاء الحق کے زمانے میں جب تہذیب و ثقافت دشمنی عروج پر تھی تو حکومت کے زیرِ غور یہ تجویز بھی آئی تھی کہ الحمرا کی عمارتوں کو 'ایوانِ اقبال' میں بدل دیا جائے۔ ڈاکٹر محمد افضل اُس زمانے میں وفاقی کابینہ کے رکن تھے اور اس حیثیت سے اُنہوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کابینہ میں اپنے ساتھیوں کو احساس دلایا کہ دُنیا میں لاہور کی پہچان ایک ثقافتی شہر کی ہے۔ لیکن یہاں ثقافتی اُمور کے لیے ڈھنگ کی ایک عمارت بھی نہیں ہے۔ اب یہ الحمرا ہال بن گئے ہیں تو اُن کو خراب نہ کرنا چاہیے۔ یوں اس تجویز کے مسترد ہونے کے بعد 'ایوانِ اقبال' کامپلیکس کی تجویز منظور ہوئی اور اس کی عمارات الحمرا کے پیچھے ایجرٹن روڈ پر تعمیر ہوئیں۔

اس واقعہ سے کئی سال پہلے جب ڈاکٹر محمد افضل پنجاب یونیورسٹی سے منسلک تھے اور اُس میں ایک نمایاں کردار ادا کر رہے تھے تو ۱۹۷۲ء میں اچانک یونیورسٹی سے اُن کا تعلق ختم کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے کا ایک وزیر موصوف تیسرے درجے میں پاس ہونے والے اپنے دو بھتیجوں کو اُن کے شعبہ میں داخل کروانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ ناجائز سفارش ماننے سے انکار کر دیا جس پر انہیں ملازمت سے قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا۔ یونیورسٹی سے تعلق ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب امریکہ جا رہے تھے کہ راستے میں کویت میں ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے اور کویت کے سائنسی تحقیق کے ایک علمی عہدہ دار سے ملے۔ دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کو اسی سائنسی تحقیقی ادارے کی سربراہی کی پیش کش ہوئی، جسے اُنہوں نے قبول کر لیا اور سات سال تک کویت میں رہے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دن تھے۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ ڈاکٹر محمد افضل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین اور صدر کے مشیر ہو کر وطن لوٹ آئے ہیں۔ سنا ہے کہ جب جنرل صاحب کویت کے دورے پر تھے، وہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر صاحب سے ہوئی، جب جنرل صاحب ڈاکٹر صاحب کے گھر گئے تو اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے فیض احمد فیض کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غزلوں کے ریکارڈ سننے کی خواہش کا اظہار کیا جو پوری کی گئی۔[(۱)]

کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں پر کئی اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس حوالے سے اُنہوں نے کئی نئے منصوبے شروع کیے اور کئی نئے تدریسی اور تحقیقی شعبے قائم کیے۔

ڈاکٹر صاحب کی واپسی کے کئی ہفتے بعد میرا اُن سے رابطہ ہوا۔ میں اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں ریسرچ سکالر کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس شعبہ کے چیئرمین پروفیسر خواجہ غلام صادق --- اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند کرے، میرے محسن اور دوست

---

(۱) اس بات کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے ایڈیٹر سے کیا تھا۔

یہاں ایک دوسری بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ جب ۱۹۷۶ء میں سالِ اقبال منانے کا فیصلہ کیا گیا تو سالِ اقبال سے متعلق سرکاری سطح پر بننے والی نیشنل کمیٹی کا پہلا اجلاس اسلام آباد میں صدر جنرل ضیاء الحق کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں خاکسار بھی شریک ہوا تھا۔ اجلاس میں ایک ممبر نے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب یونیورسٹی یا گورنمنٹ کالج لاہور کا نام علامہ اقبال رکھ دیا جائے۔ اس تجویز پر فیض احمد فیض نے کہا، صدر صاحب! کیا میں آپ کی اجازت سے ایک بات عرض کر سکتا ہوں تو جنرل ضیاء الحق نے کہا، ہاں! فیض صاحب فرمائیے۔

فیض صاحب نے جواب میں کہا کہ پنجاب یونیورسٹی اور لاہور گورنمنٹ کالج کی اپنی ایک شاندار تاریخ ہے، جس طرح آج کیمبرج یونیورسٹی اور آکسفورڈ اپنی تاریخ رکھتی ہیں۔ لیکن برطانوی حکومت نے کبھی نہیں سوچا کہ ان دونوں شاندار یونیورسٹیوں کے نام شیکسپیئر کے نام پر رکھ دیئے جائیں۔

اگر کبھی برطانیہ کو شیکسپیئر اور ہندوستان کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا تو برطانیہ شیکسپیئر کا انتخاب کرتا۔ فرض کریں اگر ہم نے آج پنجاب یونیورسٹی یا لاہور گورنمنٹ کالج کا نام علامہ اقبال رکھ لیا، تو سوال یہ ہے کہ ہم نے اقبالیات کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا؟ اقبال کی عظمت کو ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لاہور یا سیالکوٹ میں ٹیکنالوجی کا بہترین اور جدید ادارہ قائم کریں جس میں پاکستان کے ذہین ترین طالب علم آئیں۔ ان طالب علموں کو اقبال انسٹی ٹیوٹ سکالرشپ دے کر باہر جرمنی، برطانیہ یا کسی اور بلند پایہ یونیورسٹی میں بھیجے۔ اس تجویز کو جنرل محمد ضیاء الحق نے پسند کیا اور ایسے ہی کمیٹی کے ممبروں نے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی اور لاہور گورنمنٹ کالج اپنے تاریخی ناموں کے ساتھ باقی رہے۔ البتہ کیا سیالکوٹ میں علامہ مرحوم کے نام سے کوئی علمی اور سائنسی ادارہ بنا ہے یا نہیں اس کا پتہ نہیں۔ (ایڈیٹر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے لاہور دفتر کے ڈائریکٹر بھی۔ اُن کی وجہ سے میں ہفتے میں دو تین بار وہاں جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے لاہور دفتر آئے تو میری اُن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُنہوں نے میرے والد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور اس بات پر بھی خوش ہوئے کہ جدید فلسفے کے موضوع پر (تب تک) میری چند کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ اب چونکہ اُنہوں نے اسلام آباد میں رہنا تھا، لہٰذا اُن کی ہزاروں کتابیں، جو لاہور میں طویل عرصہ سے بند پڑی تھیں، اُن کو اسلام آباد بجھوانے کے لیے کمیشن کے لاہور دفتر میں لایا گیا۔ وہ خود کئی روز تک اُن میں سے غیر ضروری کتابیں الگ کرتے رہے۔ تب اُنہوں نے فلسفے کی کئی کتابیں مجھے دے دیں اور چونکہ مجھے بھی اس زمانے میں کتابیں جمع کرنے کا جنون تھا، اس لیے اپنے پسندیدہ موضوع پر کتابیں حاصل کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ اُن میں سے بعض کتابیں اب بھی میرے پاس ہیں۔

ان دنوں ڈیوڈ ریزمین کی ''دی لونلی کراوڈ'' کا بہت چرچا تھا۔ اس کتاب کے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ان دنوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دُنیا بھر میں نئے عمرانی، معاشی، سائنسی اور اخلاقی عوامل کے تحت انسانی رویّوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو اس کتاب کے ذریعے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

خیر، میری خوش قسمتی لامحدود نہ تھی۔ بعض کتابیں ایسی تھیں کہ میں اُن کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہ جاتا اور ڈاکٹر صاحب اُن کو اُٹھا کر ساتھ لے جانے والی کتابوں کے ڈھیر پر رکھ دیتے۔ ایسی کتابوں میں چند ڈکشنریاں بھی شامل تھیں۔ ایسی ہی ایک ڈکشنری برٹن سٹیونسن کی تھی جو تین ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی تھی: The Home Book of Proverbs, Maxims and Familiar Phrases تھی جسے ۱۹۴۸ء میں میکملن کمپنی نے نیویارک سے شائع کی تھی۔

یہ کوٹیشنز کی ڈکشنری ہے۔ میرے خیال میں ہر پڑھنے لکھنے والے کے پاس اس قسم کی دو تین ڈکشنریاں ضرور ہونی چاہییں کیونکہ ان سے سینکڑوں موضوعات پر بڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادیبوں، دانش وروں اور رہنماؤں کے خیالات فی الفور دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں اپنی رائے بنانے اور کسی نتیجے تک پہنچنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

خیر، ڈاکٹر صاحب نے اس وقت تو یہ کتاب مجھ کو نہ دی۔ لیکن وہ اس میں میری دلچسپی بھانپ گئے تھے۔ چھ سات سال بعد جب کہ ہم دونوں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ایک اجلاس میں شریک ہونے والے تھے، وہ یہ کتاب اسلام آباد سے لیتے آئے اور مجھ کو سونپ دی۔ یہ ایک اور بڑی خوشی تھی جو اُن کے سبب مجھے ملی۔ وہ کتاب اب بھی میرے پاس ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے تاریخ درج کیے بغیر اپنا نام لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کا ذکر ہوا ہے تو میں یہ بھی بتا دوں کہ وہ صرف پڑھنے والے تھے، لکھنے والے نہ تھے۔ ایک مرتبہ، غالباً اکتوبر ۱۹۸۹ء میں، ڈاکٹر مبارک علی اور میں اسلام آباد گئے تھے۔ وہاں ہم دونوں ڈاکٹر محمد افضل سے ملنے اُن کے گھر بھی گئے۔ یہ گھر کیا تھا، یوں سمجھیے کہ مغربی طرز کا خوبصورت میوزیم یا کتاب خانہ تھا۔ چاروں طرف سے وہ ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، میری نظر سے کبھی اُن کی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں گزری۔ ایک دفعہ جب پاکستان فلسفہ کانگریس کا ۲۵ واں سالانہ اجلاس بہاول پور یونیورسٹی میں ہونے والا تھا تو وہاں ڈاکٹر صاحب کو صدارت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ تب میں نے دیکھا تھا کہ کچھ لکھنا ایک مشکل کام ہے۔

خیر، انھی دنوں کی بات ہے، زندگی اپنے ڈھب سے گزر رہی تھی کہ ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی سے میرے کنٹریکٹ میں، غیر متوقع طور پر، توسیع نہ ہوئی۔ یوں اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ نہ صرف روزگار کا وسیلہ ختم ہو گیا بلکہ کیمپس پر رہائش کا جواز بھی نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ پریشانی کے دن تھے۔ اُن دنوں میں ڈاکٹر محمد افضل لاہور آئے۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین تھے۔ اُنھوں نے چار پانچ روز کے لیے مجھے اپنے ساتھ اسلام آباد چلنے کو کہا۔ اس وقت تو میں اُن کے ساتھ نہ جا سکا، البتہ چند روز کے بعد میں اسلام آباد پہنچا۔ میرا دوست افتخار قطب میرے ساتھ تھا، جس نے اُن دنوں [illegible] کا امتحان دیا تھا اور آج کل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ سی بی آر میں بڑا افسر ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا۔ ہم دونوں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے جو اس زمانے میں سراج کورڈ مارکیٹ کے سامنے کرائے کی ایک کوٹھی میں ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے وائین ڈبلیو ڈاٹر کی کتاب Your Erroneous Zones مجھے دی اور کہا کہ اس کا اُردو میں ترجمہ کر دو اور پہلے باب کا ترجمہ مجھے دکھانے کے بعد تم لاہور واپس جا سکتے ہو۔ ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ مسائل کا سامنا کرنے اور بھرپور زندگی گزارنے کے گُر سکھاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ کتاب بے حد پسند تھی اور وہ اس کو ایسی مفید کتاب سمجھتے تھے جو بہت سے لوگوں تک پہنچنی چاہیے۔

میں نے کتاب لی اور دو تین دنوں میں اُس کے پہلے باب کا اُردو میں ترجمہ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو بتایا تو اُنھوں نے جواب دیا، ''اچھا، آج شام کو یہ ترجمہ دیکھیں گے۔'' شام کو میں اُن کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں چودہ پندرہ سال کی عمر کے پانچ چھے بچے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ سب میٹرک کے طالب علم ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے گھریلو اور کمیشن کے ملازموں کے بچے ہیں اور یہ کہ اُن کو خاص طور پر بلایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں ترجمہ پڑھ کر سناؤں، اگر وہ ان بچوں کی سمجھ میں آ جائے تو ترجمہ ٹھیک ہے، ورنہ غلط۔ اُنھوں نے وضاحت کی ''ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے اور تعلیم کا معیار بھی کوئی ایسا قابلِ تعریف نہیں۔ لہٰذا جو کوئی عام لوگوں کے لیے کتاب لکھتا ہے یا کسی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ میٹرک کا عمومی معیار پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے برخلاف جو مصنف پیچیدہ عبارتوں، مبہم اصطلاحوں اور موٹے موٹے لفظوں پر انحصار کرتا ہے، وہ اپنا اور دوسروں کا محض وقت ضائع کرتا ہے۔''

میں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی اور تب سے میں نے جو کچھ لکھا ہے، ہمیشہ شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ [illegible] واضح اور آسان ہو [illegible] ناموزوں نہ ہوگا کہ ڈاٹر کی کتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجھے بھی بہت پسند آئی اور میں نے اس کا ترجمہ کیا۔ ترجمے کا پہلا ایڈیشن لاہور سے ''دُکھتی رگیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ نام بھی ڈاکٹر صاحب نے چنا تھا۔ بعد میں جب ادارہ تخلیقات نے اس کے مزید ایڈیشن شائع کیے تو ناشر نے عنوان بدل کر ''بھرپور زندگی گزاریے'' رکھنے پر اصرار کیا اور اب یہ کتاب اسی عنوان سے بازار میں دستیاب ہے۔

خیر، جن بچوں نے فیصلہ دینا تھا، اُنہوں نے مجھے ''پاس'' کر دیا۔ دوسرے روز سال کا پہلا دن تھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی اور جب میں صبح نو بجے اسلام آباد کے سیکٹر ایچ۔۹ میں واقع یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے دفتر گیا تو سارا شہر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر لاہور کا رُخ کروں گا۔ مگر وہ سارا دن ڈاکٹر صاحب سے کمرے میں مختلف میٹنگوں اور لوگوں سے ملنے جلنے میں بسر ہو گیا۔ چار بجے دفتر بند ہوا تو کمرے میں ایک اور محفل جم گئی۔ تقریباً چھے بجے ہم سب اُٹھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں ڈراپ کر کے اپنے گھر جانا تھا۔

جب ہم موٹر کی طرف جاتے ہوئے برآمدے میں سے گزر رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب کے پی۔اے نے مجھے ایک بند لفافہ دیا اور کہا کہ اس میں آپ کے لیے خط ہے۔ میں گیسٹ ہاؤس میں اُترا۔ کمرے میں آیا۔ لفافہ چاک کیا اور خط نکالا تو وہ تقرر نامہ تھا--- یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئر مین نے مجھے سیکرٹری کی پوسٹ آفر کی تھی۔

تقرر نامہ پڑھتے ہی--- جیسا کہ کہا کرتے ہیں--- میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے--- ''اللہ میاں، تو عادل و قادر ہے، مگر تیرے جہان میں کیا میں کل سے دھند کی تاریکی میں دفتر جایا کروں گا اور رات کے اندھیرے میں لوٹا کروں گا!''

''نہیں۔ ہرگز نہیں!'' میری روح کی گہرائیوں سے جواب آیا۔ پانچ سات سال میں نے یونیورسٹی میں گزارے تھے۔ اپنی مرضی سے جاتا اور مرضی سے آتا تھا۔ رہا کام--- واہ واہ بالکل اپنی پسند اور مرضی کا۔ اور پھر کیمپس کی گوناگوں رنگینیاں! مگر اس بے رنگ دارالحکومت میں میرے لیے کیا کشش ہے؟ بھلا تو بس فائلیں ہوں گی، فون کالز ہوں گی۔ میٹنگیں ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گی۔ حاضریاں ہوں گی اور چھٹی کے لیے درخواستیں بھی!

بس ایک ہی پل میں، فیصلہ میں نے کر لیا۔ تقرر نامہ کوٹ کی جیب میں رکھا، بیگ اُٹھایا، افتخار قطب کو ساتھ لیا اور نوکریاں دینے والا شہر چھوڑ کر لاہور روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز جب ڈاکٹر محمد افضل کو صورتِ حال کا علم ہوا تو اُنہوں نے میرے ہاسٹل فون کیا۔ لیکن میں اٹینڈنٹ کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ میرے لیے کوئی کال آئے تو وصول نہ کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر خواجہ غلام صادق اور کئی دوسرے دوستوں کو فون کیے اور اُن سے کہا کہ مجھے ''راہِ راست'' پر لانے کے لیے وہ دباؤ ڈالیں۔ لیکن بے روزگاری کا عذاب سہنے کے باوجود میں نے اسلام آباد نہ جانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ چند روز بعد یہ معاملہ دب گیا۔

میرا خیال تھا کہ اس بدتمیزی کے بعد ڈاکٹر صاحب ناراض ہوں گے اور اُن سے تعلق نہ رہے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ لاہور آئے تو اُنہوں نے پھر مجھے فون کیا۔ میں اُن سے ملنے گیا تو وہ پہلے جیسی شفقت سے پیش آئے اور اس ناگوار واقعہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہی نہیں، بلکہ دو تین ماہ بعد اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم یونیورسٹی میں رہنا چاہتے ہو اور تمہیں رہنا بھی یہیں چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں یہیں کوئی جگہ مل جائے۔''

اُنہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشین سٹڈی سنٹر میں میرے لیے گنجائش پیدا کرنی چاہی۔ یہ مرکز چند سال پہلے قائم ہوا تھا اور انہی برسوں میں جنوبی ایشیائی مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی تاریخ پر میری دو تین کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ غالباً انہی کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب نے یہ سنٹر منتخب کیا تھا۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سربراہ کے طور پر ڈاکٹر محمد افضل جنوبی ایشیائی مطالعاتی مرکز کے بورڈ آف گورنرز کے سربراہ بھی تھے۔ چنانچہ جب بورڈ کا اجلاس ہوا تو وہ کتابیں لے کر شرکت کے لیے گئے۔ مگر مجھے احساس تھا کہ جنرل ضیاالحق کے اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب جیسا بااثر مہربان بھی یونیورسٹی میں میرے لیے آسانی سے جگہ نہ بنا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں بے لچک دائیں بازو کا راج تھا اور بعض کردہ اور ناکردہ گناہوں کے باعث مجھ کو جوشیلے بائیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بازو سے منسوب کیا جاتا تھا، اس لیے میرا وہاں جانا مناسب نہ تھا۔

چنانچہ چند روز بعد اُنہوں نے مجھے خود اپنے ادارے، یعنی گرانٹس کمیشن کی طرف سے سینئر ریسرچ فیلوشپ دے دی جس سے میں ۱۹۸۴ء تک فائدہ اُٹھاتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری برسوں میں اُن سے میل ملاپ کے زیادہ تر مواقع ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی وجہ سے ملتے رہے۔ طویل عرصے سے ڈاکٹر صاحب اس ادارے کے بورڈ آف گورنرز کے سرگرم رکن تھے اور مجھ کو بھی اس بورڈ کی رکنیت کا اعزاز دیا گیا تھا۔ بورڈ کا اجلاس سال میں ایک بار ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں ادارے کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن بھی تھے اور اُس کا اجلاس ہر تین ماہ بعد ہوتا ہے۔ یہ اجلاس عموماً بورڈ کے صدر سیّد شاہد علی شاہ صاحب کے دفتر میں ہوا کرتے اور وہاں ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں رہتیں۔ ان اجلاسوں کے لیے وہ عموماً ایک روز پہلے اسلام آباد سے تشریف لے آتے اور کبھی بلا لیتے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اُن کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ یہ دونوں ڈاکٹر صاحبان دوست تھے اور ایک دوسرے کے مداح بھی۔

بورڈ آف گورنرز گویا دوستوں کا حلقہ ہے۔ بورڈ کے چیئرمین محترم سیّد واجد علی شاہ ہیں۔ وہ ہماری اجتماعی اور اخلاقی روایات کے امین ہیں اور سب سے محبت اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ دیگر ارکان میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین افتخار عارف؛ کراچی سے ڈاکٹر حسین محمد جعفری؛ سندھ سے غلام ربانی آگرو اور لاہور سے ڈاکٹر خالد حمید شیخ شامل ہیں جب کہ بورڈ کے صدر سیّد شاہد علی شاہ ہیں جن کی توجہ سے کام سلیقے سے طے پا رہے ہیں۔ بورڈ کا اجلاس ہوتا ہے تو گویا پرانے دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد افضل سے آخری ملاقات بورڈ کے اجلاس میں ہوئی۔ مگر یہ اجلاس خوشگوار ماحول میں نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کئی ہفتوں سے علیل تھے۔ وہ اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد سے آئے تو، مگر واکر کی مدد سے چل رہے تھے اور بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ اُن کو دیکھ کر رنج ہوا۔ صاف [illegible] شخص زندگی کی آخری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منزل سے گزر رہا ہے۔ دوسری طرف حضرت سیّد واجد علی شاہ صاحب بھی صاحبِ فراش تھے اور اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف نہ لا سکتے تھے۔ لہٰذا بورڈ کے ارکان کی خواہش پر یہ اجلاس شاہ صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ ان دونوں مہربان بزرگوں کو اچھی حالت میں نہ دیکھ کر بورڈ کے تمام ارکان کا دل بہت بوجھل ہوا اور زندگی کی بے وفائی کا گہرا احساس ذہن پر چھا گیا۔

اجلاس کے بعد ہم لوگ کمرے سے باہر نکلے۔ باہر موٹریں کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کا ڈرائیور موٹر لے کر آگے آیا۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھنے لگے۔ ہم اُن کے گرد جمع تھے۔ اُنہوں نے باری باری ہاتھ ملایا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے اُنہوں نے مسکرانا چاہا۔ لیکن میرے پاس جواب میں مسکراہٹ نہ تھی۔ جی میں بار بار یہ وسوسہ ہلچل مچا رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات ہے۔

آخر وہ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور غلام ربانی آگرو کے ساتھ موٹر میں بیٹھے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

© rasailojaraid.com